

# ایک دن

بانو قدسیہ



فہرست





ٹرین حیدر آباد کے سٹیشن پر کھڑی تھی۔  
اُس کے ڈبے میں سے وہ رنگین اور نازک صراحیاں صاف نظر آ رہی تھیں  
جن کی مٹی کا رنگ نارنجی اور نیل بوٹوں کا نمونہ خالص سندھی تھا۔ دو امریکن میپس  
ہاتھوں میں دو دو صراحیاں تھامے دوکاندار سے سودا کر رہی تھیں۔ اُن کے لکیر دار  
فراک گھٹنوں سے نیچے تنگ اور بغلوں تلے بہت زیادہ کھلے تھے۔ استینیں غائب  
تھیں اور گرمی سے جھلسی ہوئی گردنوں اور سینوں کا کھلا حصہ بہت سُرخ نظر آ رہا تھا۔  
معظم نے ان کے ہاتھوں میں تھامی ہوئی صراحیوں کو بڑی لپچا ہٹ سے نیکھا  
اور اس کا جی چاہنے لگا کہ کاش وہ بھی ایک نازک سی صراحی زر قاسم کے لئے خرید  
لے۔ زر قاسم خود بھی تو ایک ایسی صراحی تھی ممولے سی گردن، پھیلے ہوئے کولے اور  
نازک نازک بازو اور پتلے سے ہاتھ۔ اس کا دہن اتنا لطیف اور ننھا تھا  
کہ اس پر ذرا سی مسکراہٹ بھی دباؤ ڈال دیتی۔

اس وقت ان ہی ہونٹوں سے نکلی ہوئی اک چھوٹی سی ”ہاں“ اُسے میلوں کا  
سفر کیسے پر مجبور کر رہی تھی لیکن صراحی خریدنے کا تو سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا بلکہ

خریدنے کے بعد اُس کے پاس بمشکل اتنے پیسے بچے تھے جن کے سہارے وہ زرقا کے ہاں بس ٹیکسی میں پہنچ سکتا تھا۔ زرقا کے ہاں ٹیکسی میں پہنچنا بھی تو بہت ضروری تھا۔ کیونکہ رانی اور گکو ہمیشہ نیچے کھیلا کرتی تھیں۔ جب وہ اوپر جا کر سب کو بتائیں گی کہ معظم بھائی یہ لمبی ٹیکسی سے اترے ہیں تو زرقا ایک بار گردن اٹھا کر غر سے سب کی طرف دیکھے گی اور دل ہی دل میں کہے گی ٹیکسی مت کہو ہوائی قالین کہو۔ شہزادے ہمیشہ باد پاتا لینوں پر سفر کیا کرتے ہیں! پھر اُس کے نازک ہونٹوں پر مسکراہٹ کا بوجھ پڑ جائے گا اور وہ سر جھکا کر بند روڈ کی رونق کو کھڑکی میں سے دیکھنے لگے گی۔

معظم کا کتنا جی چاہتا تھا کہ ایک بار ان نازک ہونٹوں پر اتنا دباؤ ڈالے اتنا دباؤ ڈالے کہ زرقا دوبارہ گھوم کر بند روڈ کی دور تک پھیلی ہوئی رونق نہ دیکھ سکے۔ اور اس کی آنکھوں کی ساری سرد مہری، بیگانگی اور اجنبیت معظم پر پکار اٹھے۔ لیکن زرقا ہمیشہ اُس کے قریب رہ کر بھی دور دور رہتی تھی۔ بالکل اسی طرح جیسے ناشتے کے رُے لئے سفید شعلے والے بیرے ہوٹلوں سے گزرتے تھے اور دور رہتے تھے۔ بد قسمتی سے وہ چار انڈے جو وہ لیکر سفر پر روانہ ہوا تھا کچے نکلے۔ ان کے ساتھ اُسے ناشتہ کرنا تھا لیکن جب انڈے لائین کے قریب منڈلانے والے ایک کتے نے چاٹ لئے تو اس نے انتقام کے طور پر چائے سے بھی پرہیز کیا۔

سماٹھ سٹیشن پر گاڑی کافی دیر تک رکی رہی اور عین اس کے ڈبے کے سامنے مٹھائی والے لائیاں بجا بجا کر پوریاں بیٹا رہا۔ لیکن اس کی جیب میں جتنے پیسے تھے انہیں وہ کراچی کے لئے محفوظ رکھنا چاہتا تھا۔ ان پیسوں کے ساتھ اسے زرقا کے ہاں ٹیکسی پر پہنچنا تھا اسی لئے وہ ہر سٹیشن پر اس بے اعتنائی سے

کھڑکی کی طرف پیچھ کر لیتا جیسے ابھی کل کا کھانا بھی ہضم نہ ہوا ہو! امریکن عورتوں نے نازک صراحیاں خریدیں سفر کی اکتاہٹ دور کرنے کے لئے دو ایک رسالے لئے اور پھر کینوس کے جوتے لچکاتیں اپنے ڈبے کی طرف چلی گئیں۔ معظم کے ساتھ والی سیٹ پر ایک عورت تیسری بار ناشتہ کر رہی تھی۔ اس کا دو سالہ بچہ کیک کو ٹوم کر فرش پر بکھیر رہا تھا اور اس کا شوہر اخبار پڑھتے ہوئے کوئی بارھویں مرتبہ کہہ رہا تھا۔

”دیکھو بھوکی نہ رہنا۔ کو تو کچھ اور منگوا دوں!“ وہ عورت مسلسل کچھ نہ کچھ کھا رہی تھی لیکن شوہر کے اس سوال پر وہ ہر بار کہتی۔ ”توبہ! گھر جیسا آرام سفر میں کہاں۔ زندگی عذاب ہو گئی ہے نہ کچھ ڈھنگ کا کھانے کو ملا ہے نہ کام کی چائے نصیب ہوئی ہے۔ کوئی کھائے تو کیا؟“

ڈیزل انجن نے لمبی سی ہوک بھری پھر گاڑی سیٹی سنائی دی۔ اور گاڑی آہستہ آہستہ رفتار پکڑنے لگی۔ وہ دروازے والی کھڑکی کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا۔ سامنے لائینوں کا جال بچھا تھا۔ گاڑی ان بھول بھلیوں میں اپنی لائین تلاش کرتی ڈگا ڈگا ڈگا بھاگ رہی تھی۔ پھر یک لخت اس کی پشت کی جانب کسی دوسری ٹرین کے گزرنے کا ہنگامہ خیز شور اُٹھا۔ پرانی وضع کا انجن دھواں اڑاتا اپنی شافٹ فٹ، ہلا تا آنا فاناٹنگا ہوں سے اوجھل ہو گیا۔ ڈبوں میں بیٹھے ہوئے مرد عورتیں بچے اُس کی پہچان سے بہت پہلے رخصت ہو گئے اس نے گردن موڑی اور سامنے پھیلی ہوئی بھاڑیوں، لائین پر پھیلے ہوئے پتھروں اور اکا دکا درختوں کو دیکھنے لگا۔

وہ سوچ رہا تھا کہ اب کی بار اُسے زرقا کے ساتھ کوئی فیصلہ کن بات



”بتی ہوگی تو۔“

”تو بدھی شتر مرغ۔ رانی نے چڑ کر کہا۔“

”بس تمہارے تو ذہن پر ہمیشہ شتر مرغ سوار رہتا ہے اور کچھ دیکھا جو نہیں۔“

”کیوں دیکھا کیوں نہیں، ابھی تو بچے بچتے ہیں چڑیا گھر گئی تھی۔“

”لگو غمر سے بولی۔ اور ہمیں حبیب بھائی جب ہم چاہیں لے جاتے ہیں۔“

”یہاں کے چڑیا گھر میں رکھا ہی کیا ہے۔ تم نے لاہور کا چڑیا گھر دیکھا

ہوتا تو کبھی یہاں کے گاندھی گارڈن کا نام بھی نہ لیتیں۔“

”بھلا وہاں اثر دبا ہے کیا؟“ لگو نے جل کر پوچھا۔

”اثر دبا نہیں ہے۔ لیکن پہلی چشموں والا چیتا تو ہے۔ یہ بڑی بڑی نارنجی آنکھیں

ہیں اُس کی تم دیکھو تو مارے ڈر کے مر جاؤ۔ جب میں پچھلی دفعہ آماں کے ساتھ

لاہور گئی تھی تو مجھ بھائی نے مجھے خود دکھایا تھا۔“ رانی بولی

”وہاں زیر براج بھی نہیں ہے نہیں ہے نا؟۔“

”رانی بحث میں ہار رہی تھی اس لئے اٹھتے ہوئے بولی۔“ زیر کونسا

ایسا تنگ ہے۔ یہاں نہ تو اوڈو بلاڈ ہے نہ سفید مور نہ بندر۔ یہ بھی کوئی چڑیا گھر

ہے۔ ذرا بھی دیکھنے کو جی نہیں چاہتا۔“

”لگو کو غصہ آگیا وہ چمک کر کہنے لگی۔“ اس دن تو مان گئی تھیں کہ یہاں کا

چڑیا گھر زیادہ اچھا ہے۔“

”اس دن تو تو اپنی مونگ پھیاں نہیں ریتی تھی اس لئے میں نے کہہ دیا تھا۔“

”لگو بھلا کر بولی۔“ تم ہو ہی مطلبی اپنا مطلب ہوتا ہے تو سب کچھ مان جاتی ہو۔“

”پہلی چھت والی ایک ٹیکسی بڑی شاہراہ کو چھوڑ کر فلیٹ والی سڑک کی طرف

مڑی۔ اُن سے پرے والے بلاک کے پاس لمحہ بھر کے لئے رُکی اور پھر ان کی طرف بڑھ آئی۔

”گلو تالیاں پھینتی ہوئی چلائی۔“ دیکھا..... دیکھا..... دیکھا..... مجھ بھائی

ٹیکسی میں آئے ہیں پہلی ٹیکسی میں..... ہاں..... ہاں..... ہاں.....

”رانی کو مایوسی تو ہوئی۔ لیکن معظم کے آنے کی اُسے اتنی خوشی ہوئی کہ اُسے

اپنی شکست کا احساس بھی نہ رہا۔ معظم نے کار کا پیٹ کھولا اپنا اٹیچی اور کپل

اٹھایا اور باہر نکل آیا۔

”ہیلو رانی۔“ لگو۔“

”دونوں بچیاں سلام کر کے آگے بڑھیں رانی تو معظم سے چمٹ گئی لیکن لگو

ٹیکسی کا میٹر پڑھنے لگی۔

”دو روپے چار آنے۔“

پھر اس نے ڈرائیور کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔“مجھ بھائی اس بار تو

آپ پورے چھ مہینے بعد آئے ہیں۔“

”ہاں کچھ دیر سے ہی آیا ہوں۔“

”صبح آپ کا تار ملا تھا۔ میں تو تب سے باہر ہی بیٹھی ہوں۔“

”لگو کرانے کی تفتیش کر کے لوٹی تو آتے ہی بولی۔“ آج ہمیں بھتی تھی مجھ بھائی

لاسٹ بیٹروڈے۔“

”اور دوسرے لوگ کہاں ہیں؟“ معظم نے بظاہر بے پردائی سے پوچھا۔

”وہ دیکھئے دیکھ رہی ہیں نیچے۔“

”معظم نے چہرہ اٹھا کر اوپر دیکھا۔

تیز گلناری رنگ کے پردے ایک طرف کو گئے زرقا، بیلی اور شیریں کھڑی



تھیں۔ لیلیٰ اور شیریں کی دود چوٹیاں سامنے بیٹھنے پر لٹک رہی تھیں اور زرقا کی لمبی بوجھل چوٹی اس کے پہلو سے نکل آئی تھی۔ معظم خوب جانتا تھا طویل بالوں کا یہ سلسلہ جسم کے کس حصے پر جا کر ختم ہوتا ہے۔

فلیٹ کے سامنے پیلی ٹیگسی کے پہنچنے سے تھوڑی دیر پہلے وہ تینوں بہنیں اپنے اپنے کپڑے درست کرنے میں مشغول تھیں۔ دُلی پتلی لیلیٰ نے اپنی زرد کاٹن کی قمیص دیوان پر پھینکتے ہوئے کہا۔ ”تو بہ رواج بھی کیا چیز ہے جب تک دل اُوب نہ جائے کوئی پیچھا ہی نہیں بھڑتا۔“ ان قمیصوں کا بھی کیا فیشن چلا ہے۔“

شیریں قالین پر بیٹھی تھی وہ لیلیٰ کی طرف چہرہ اٹھائے بغیر کہنے لگی۔ ”اب تو ہر سڑک پر ہر لڑکے کی یہی پیلے کرتے پہنے نظر آتی ہے مجھے تو یوں لگتا ہے جیسے سارے کراچی میں ایک ہی سیندھوری لڑکی گھوم رہی ہے۔“

لیلیٰ ہنس کر بولی۔ ”ابھی یہاں کیا دیکھا ہے تم نے لاہور میں تو یہ عالم ہے کہ کسی پریشمی کپڑا نظر تک نہیں آتا۔ ہمارے کالج کی تمام لڑکیاں ان ہی رنگین کاٹنوں میں نظر آتی ہیں۔ کسی نے سیاہ کار لگا لیا ہے تو کسی نے سیاہ بٹن۔“ لیکن گلا تو بوٹ شپ ہی اچھا لگتا ہے۔“ شیریں نے استری کا بٹن بند کرتے ہوئے کہا۔ لیلیٰ نے اپنی زرد قمیص کے پاس بیٹھ کر دُلق سے کہا۔ ”اور آستینیں بھی چھوٹی ہی بھلی معلوم ہوتی ہیں۔“

ان دونوں سے ذرا پرے دیوان پر زرقا خاموش بیٹھی تھی۔ اس کے سامنے اس کے سارے کپڑے گڈ مڈ دھرے تھے کھلی کھڑکی میں سے سمندری ہوا کے تیز جھونکے آرہے تھے اور کھڑکی میں لٹکے ہوئے گلناری رنگ کے لمبے لمبے پردے

ادھر ادھر لہرا رہے تھے۔ زرقا کی لمبی گاؤم چوٹی نیچے تکیے پر بل کھا کر لیٹی ہوئی تھی اور ماتھے کے ارگرد باریک بال ہوا سے لرز رہے تھے۔ اس کے گھٹنے تلے معظم کا تار دبا تھا جس میں اس کے آنے کی اطلاع درج تھی۔ وہ اس تار کو بڑی ترکیب سے اماں کے کمرے میں سے کھسکا کر لائی تھی اور اب گھٹنے تلے پڑے ہوئے اس تار کا اسے یوں احساس ہو رہا تھا جیسے کسی کا دھڑکتا ہوا دل اس کی ران تلے آگیا ہو۔

دوسری منزل کے اس فلیٹ میں تین کمرے تھے۔ جگہ چھوٹی تھی لیکن موزیک کے پکے فرش اور ڈسٹپر کی ہوئی دیواروں نے اس ننھے سے فلیٹ کو بڑی صاف ستھری عطا کر رکھی تھی۔ ہلاک کی سیڑھیاں عین ان کے دروازے کے سامنے اوپر کی طرف مڑتی تھیں۔ سیڑھیوں کا دروازہ کھلتا تو ڈرائنگ روم نظر آتا۔ اسی میں ایک جانب کھانے کی بڑی میز اور نازک نازک ٹانگوں والی چھ کرسیاں پڑی تھیں۔ ایک طرف چمکتی پالش والا تین تختوں والا سائیڈ بورڈ تھا۔ جس پر برتنوں کی جگہ اماں جان کا پانڈاں ان کی سلائی کی ٹوکری اور گھر بلو حساب کی کاپی دھری رہتی تھی۔

کمرے کے ڈرائینگ روم والے حصے میں ایک صوفہ دھرا تھا جس پر بوسیدہ ہنر رنگ کا پھولوں والا کپڑا منڈھا تھا۔ سڑک کی جانب کھلنے والی کھڑکی پر نارنجی اور اندر کی طرف جانے والے دروازے پر گہرے نیلے رنگ کے پردے لٹکے ہوئے تھے گلدانوں میں پلاسٹک اور کاغذ کے مہندھی پھول آراستہ تھے کھڑکی کے سامنے بڑا سا دیوان تھا جس پر گہرے ہنر رنگ کا غلاف چڑھا تھا اور اوپر ہر رنگ کے چھوٹے بڑے تکیے بے ترتیبی سے دھرے تھے۔ سارا گھر لڑکیوں سمیت ٹیکنی کر تھا۔

اس ڈرائینگ روم میں اندر کی طرف دروازے کھلتے تھے۔ جس کمرے میں لیلیٰ شیریں اور زرقا رہتی تھیں اس کی کھڑکی سڑک کی جانب کھلتی تھی ساتھ والے

کمرے میں اماں، لگوا اور گڈی رہتی تھیں۔ یہ کمرہ قدرے بڑا تھا لیکن اس میں کوئی کھڑکی نہ تھی جو سڑک کی جانب کھلتی ہو اسی لئے رانی اور لگو کو ہمیشہ فلیٹ سے اتر کر سڑک پر کھیلنا پڑتا۔

اماں جی کے کمرے کے سامنے چھوٹا سا برآمدہ اور پھر صحن تھا جس کے سامنے دائیں جانب باورچی خانہ اور بائیں طرف سٹورا اور غسل خانہ تھا۔ باورچی خانے کے ساتھ دوسرے فلیٹ سے علیحدہ کرنے والی کچھ پیوں کی پارٹیشن تھی۔ اس دیوار کے دو تین تختے بالکل ڈھیلے تھے اور ذرا سادہ کانٹے پر اکڑ جایا کرتے تھے لیلی اکثر کہیں سے ڈھونڈ کر ہتھوڑی لاتی ڈیرہ اپنچ کے کیل منگوائے جاتے اور اکھڑے ہوئے تختوں کو جوڑا جاتا۔ عین سامنے اونچی دیوار تھی جس کے ساتھ ساتھ منوازی وہ تار بندھی تھی جس پر دن بھر سمندری ہوائیں گیسے کپڑے اڑاتی رہتی۔

سٹور کی ایک خوبی یہ بھی تھی کہ اس میں جب کبھی ضرورت پڑتی ایک آدھ چار پائی بھی ڈال دی جاتی۔ اور یہ ضرورت عام طور پر زرقا کو ہی پیش آتی اس کی دونوں چھوٹی بہنیں جب اتنی باتیں کرتیں کہ اس کے سر میں درد ہونے لگتا تو وہ چپکے سے اپنا چھوٹا سا ایچی اٹھاتی اور خاموشی سے اسٹور کی راہ لیتی۔ ایچی اٹھانا اس لئے ضروری تھا کہ اس میں معظم کے خطوط تھے گویلی اور شیریں ان خطوں سے واقف تھیں۔ لیکن پھر بھی وہ انہیں ان کی دہرے سے محفوظ رکھنا چاہتی تھی سٹور میں دیواروں کے ساتھ ساتھ لٹل کی دو دوسلیں لگی ہوئی تھیں ان پر گھر بھر کے صندوق رکھے تھے۔ بڑے لکڑی کے صندوق، چمڑے کے صندوق، فائبر کے سٹکیس اور بید کے مستطیل بکس۔ ان کے درمیان اتنی کھلی جگہ تھی جہاں زرقا اپنی چھوٹی سی چار پائی بچھا کر لیٹ سکتی تھی۔

یہاں چار پائی پر لیٹ کر بیس واٹ کے مدھم بلب میں معظم کے خط پڑھ کر

اسے عجب طرح کا سکون ملتا۔ اسے لگتا جیسے مجھ دنیا کے تمام مردوں سے مختلف ہے۔ وہ گوشت پوست کا بنا ہوا مرد نہیں ہجر کا ایک شعر خیام کی اک رباعی ہے

اک حسین پھول ہے جو لمس سے ہمیشہ مر جھا جایا کرتا ہے  
معظم کے خط مقطر اور ہلکے پھلکے جذبات سے اس قدر پڑھتے گویا وہ  
زرقا کے قرب کا ذرا بھی تمنائی نہیں اور اگر اسے اس چیز کی تمنا ہے بھی تو اس  
تمنا میں ہوس کا شائبہ تک نہیں

زرقا کو اسی چیز کی مدتوں سے تلاش تھی۔ وہ مرد کی نظر میں عقیدت اور  
پرستش دیکھنا چاہتی تھی۔ اسے ان نظروں میں جسم کی والمانہ طلب سے نفرت  
تھی۔

اس وقت بھی کھڑکی کے ساتھ بچھے ہوئے دیوان پر بیٹھی زرقا یہ سوچ رہی  
تھی کہ معظم ہفتے بھر کے لئے کراچی آئے گا۔ یہ ہفتہ کتنی مسرت میں گئے گا۔  
لیکن اس سے بڑی مسرت اس وقت حاصل ہوگی جب میں سٹور میں چار پائی بچھا کر  
پہروں اس ہفتے کو ذہن میں دہرایا کروں گی۔ ہوئے ہوئے اس ہفتے کا ہر ایک  
لمحہ میرے دل کی لوح پر ہمیشہ کے لئے ثبت ہو جائے گا اور پھر اس کو کوئی بھی  
میرے دل سے کھرچ نہ سکے گا۔

لیلی نے شیریں کو آکھ مار کر کہا۔ ”آپا پھر گم ہیں۔“  
شیریں نے کپڑوں کی تہہ لگاتے ہوئے آہستہ سے کہا۔ ”گم نہ ہوں تو اور  
کیا ہوں۔“

لیلی اس کے قریب آکر نیچی تپائی پر بیٹھ گئی اور بولی۔ ”جانتی ہو کیا سوچ  
رہی ہیں۔“

”تو آؤ پھر اپنی باتیں کریں۔“ شیریں نے بات کی۔

”اور یہ جو سن رہی ہیں“ دفنگ دفنگ کی مدد سے لیلیٰ بولی۔  
 زرتقا کو یہ دفنگ دفنگ کی زبان نہ آتی تھی۔ ویسے بھی جب کبھی لیلیٰ اور شیریں  
 یہ زبان استعمال کرتیں تو زرتقا چڑھ کر کمرے سے نکل جاتی۔ لیکن آج وہ اس کھڑکی کے  
 پاس سے ہلنا نہ چاہتی تھی۔ اس نے چہرہ سڑک کی جانب پھیر لیا اور سوچ میں  
 ڈوب گئی۔

”بھلا آپا کا بیاہ کس سے ہوگا“ لیلیٰ نے ف کی بولی میں پوچھا۔  
 ”تمہیں کیوں فکر ہے بڑی بی؟“ شیریں نے اسی زبان میں جواب دیا۔  
 لیلیٰ بڑی بی کا لفظ سنتے ہی بھڑکی اور کہنے لگی۔ ”اب ہم کالج میں داخل  
 ہو گئے ہیں۔“

اب ہماری عزت کیا کرو۔  
 ”ہو تو فٹ ایئر فوٹ ہی نا۔“ شیریں شوخی سے بولی۔

”شیریں!۔۔۔۔۔“ لیلیٰ غرائی۔  
 شیریں نے مسکین صورت بنا کر ہاتھ باندھ کر کہا۔ ”اگر جان کی امان  
 پاؤں تو ایک بات عرض کروں۔“

”کہو۔۔۔۔۔“ لیکن ایسی کوئی بات نہ ہو جس سے ہماری بے عزتی کا پہلو نکلتا  
 ہو“ شیریں نے مسکرا کر کہا۔ ”ہمیں یہ کہنا تھا لیلیٰ بیگم کہ بس سال بھر کے وقفے  
 پر اتنا ناز کرتی ہو۔ ہم بھی سال بھر میں کالج میں ہوں گے۔ ایسی کونسی بڑی  
 بات ہے۔“

زرتقا نے منہ پھیر کر ان لڑتی جھگڑتی میناؤں کی طرف دیکھا تو شیریں خاموشی  
 سے قمیص استری کرنے لگی اور لیلیٰ نے سوئی میں دھاگہ پرونا شروع کر دیا۔  
 ”آپا معظم بھائی آتے ہی ہوں گے اب تو۔۔۔۔۔“ لیلیٰ نے بھگی بلی بن کر پوچھا۔

آہستہ سے زرتقا نے ہاں کہہ کر پھر منہ کھڑکی کی طرف پھیر لیا۔  
 لیلیٰ نے شیریں کو آنکھ ماری اور اپنی بولی میں کہنے لگی۔ ”بڑا زبردست  
 انتظار ہو رہا ہے۔“

”مجو بھائی بھی تو چھ ماہ سے تشریف نہیں لائے۔ انتظار تو خود ہونا ہی ہوا  
 ۔۔۔۔۔“ شیریں نے ہولے سے کہا۔

”اگر مجو بھائی جیت گئے تو حبیب بھائی کا کیا بنے گا؟“ لیلیٰ نے پوچھا۔  
 شیریں نے مسکرا کر کہا۔ ”وہی جو ہیرو کی موجودگی میں بیچارے ولین کا بنا کرتا ہے۔“  
 دونوں چوٹیوں کو سینے پر ٹھیک سے لٹکا کر لیلیٰ نے بڑی آہستگی سے شیریں  
 سے کہا۔ ”اگر کہیں خدا نخواستہ کوئی جنگ ونگ ہو گئی تو۔۔۔۔۔“  
 ”نہیں بڑی بی تم بے فکر رہو۔“

”پھر وہی بڑی بی۔۔۔۔۔ بڑی بی ہوگی تو۔۔۔۔۔ تو۔۔۔۔۔“  
 سڑک پر آنے والی پہلی ٹیکسی جب موڑ کاٹ کر پہلے بلاک پر رُکی تو زرتقا جلدی  
 سے دیوان پر سے اٹھی اور کھڑکی کے سامنے کھڑی ہو گئی اور معظم کا تار دیوان پر ننگ  
 دھڑنگ بچے کی طرح سوتا رہ گیا۔

اسے یوں اٹھتے دیکھ کر لیلیٰ اور شیریں بھاگ کر اس کے پہلو میں کھڑی ہو گئیں۔  
 ان کی دودو چوٹیاں سامنے سینوں پر آٹکیں اور زرتقا کی لمبی بو جھل چوٹی اس کے پہلو  
 سے نکل آئی۔ معظم اٹھی اور کھیل نکال کر باہر نکلا تو لیلیٰ اور شیریں نے بڑے تپاک  
 سے ہاتھ ہلائے اور لیلیٰ شیریں سے بولی۔ ”ایک آبا جی ہیں سولہ سولہ خط ڈالو  
 تو بھی کبھی نہیں آتے ایک مجو بھائی ہیں کہ ادھر ادھر ملتا ہے ادھر روانہ ہو جاتے ہیں“  
 ”کویت کوئی لاہور تو ہے نہیں کہ خط ملتے ہی گاڑی پکڑ لیا۔“ شیریں بولی  
 ”کوئی ایسا سات سمندر پار بھی تو نہیں۔۔۔۔۔“